فکرِ سرسید ---- عہدِ موجود کی اشد ضرورت

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ

Abstract:

Sir Syed Ahmed Khan was a great reformer, reductionist, political thinker and revolutionary leader of Sub-Continent. His efforts are very important in the history of Indian Muslims. He established numerous institutions such as Muhammad Anglo Oriental (MAO) College, Scientific Society and Muslim University, Ali Gargh which turned into a multi-dimensional socio-political movement.

Due to his efforts and thoughts, not only Indian Muslims evolved in all walks of life but it was actually his foresight which came into existence in the shape of Two Nation Theory and Pakistan. His thoughts are more relevant now a day.

اکبر الہٰ آبادی نے کہا تھا:

ہماری باتیں ہی باتیں تھیں، سید کام کرتا تھا!

انسانوں کے جنگل کو ترتیب دینے اور باقاعدہ تہذیب بنانے والے یوں تو حضر ت آدم سے لے کر بیسویں صدی ٔ عیسویں تک بہت سے عظیم لوگ ،تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں مگر جب ہم بر صغیر پاک و ہند کی خصوصی تاریخ و تہذیب پر نظر کریں تو معدودے چند دانشوروں میں سے سر سید احمد خان کا نام سرفہرست ہے۔اس بات میں کسی کو بھی مفر نہیں کہ سر سید کی شخصیت اور ان کے نظریات و افکار، اہل نقد و نظر کی آنکھ میں کھٹکتے رہے ہیں اور وہ تقریباً ایک صدی تک انتہائی متنازعہ بھی رہے ہیں ان کی خدمات پر رنگ رنگ کے لوگوں نے اپنی آرا ثبت کیں اور ان کی مذہبی مساعی، انگریز وفاداری، مغربی علوم کی طرفداری ، قوم کی اصلاح پروری، ان کی عقلیت پسندی ،ان کا نظریہء فطرت اور ان کی تصنیفات کو نشانہء تنقید بنایا جاتا رہا ہے اور تاریخ کے دھارے بدلنے والے کو متنازعہ شخصیت بنا کر پیش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ سر سید کی شخصیت اور ان کی جدو جہد معاصرین و متاخرین دونوں کے واسطے نزاعی رہی ہیں۔کم علم تو خوشہ چینیوں اور مو شگافیوں سے باز نہیں آتے تھے یہ بات تو ایک طرف، ہر صاحبِ ذکا نے بھی ان پر قلم فر سائی کی ہے۔ کسی نے محبت کے ساتھ ، کسی نے مخالفت میں اور کسی نے معروضی انداز میں ان کو پرکھا۔اہل دانش کو یہ اعتراف ہے کہ سر سید احمد خان ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ انہوں نے تضادات و نظریات سے بالاہو کر انسانیت کی خدمت کی۔آپ نے ۱۷ اکتوبر،۱۸۱۷ء بمطابق ۵ذوالحجہ۱۲۳۲ھ کو دہلی شہر میں اپنے ناناخواجہ فرید کی حویلی میں جنم لیا۔آپ نے ہوش سمبھالا تو گردو پیش میں اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔تہذیب دو طرح سے تبدیل ہوتی ہے ایک بدیہی تبدیلی فطری طریقے سے آتی ہے اور دوسری تبدیلی کی مثال گلوبلائزیشن کے دور میں مصنوئی ردوبدل ہے جسے آپ مصنوئی تبدیلی کہہ سکتے ہیں۔بر صغیر پاک و ہندمیں ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۶ء تک کم و بیش انگریز کی چلتی رہی۔اس دوران اقدارو روایات کے ہمراہ تعلیمی میدان بھی اپنے نظریات میں تبدیلی کا خواہاں تھا۔پرانے اعتقادات اور علوم کی جگہ سائنس اور نئے رجحانات جنم لے رہے تھے یا تھوپے جا رہے تھے۔ دونوں کا ایک ہی معنی لیا جا رہا تھا۔ نئے تبلیغی مراکز اپنے طور پر فعال ہورہے تھے۔سرسید نے اس منظرنامے کو بہ نظر غائر محسوس کیا اور ساری زندگی حرف اور کتاب سے معانقہ رکھا۔سر سید نے اپنی زندگی اس عظیم مقصد کے لیے ایسی وقف کی کہ ان کے بڑھاپے کے ایام کا ذکر کرتے ہوئے مولا نا الطاف حسین حالی کا کہنا تھا کہ

> ’’دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثلِ جوان آدمیوں کے کرتے تھے البتہ نسیان بڑھ گیا تھا،دانت بھی جھوجھرے ہو گئے تھے،چلنا پھرنا

اُٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا،کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب وہ دوچار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے،باوجود اس کے تصنیف اور تحریر کا کام جو بہ منزلہء ستہ ضروریہ کے ہو گیا تھا،اخیر دم تک برابر جاری رہا"(۱)

آل احمد سرور کی ان کے بارے میں ایک معتبر رائے ہے۔وہ ان کے متعلق اکثرو بیشتر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے ہیں ۔ وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ

''ان کا اس(زبان)سے بڑا کارنامہ اسلوب کی دنیا میں ہے جسے انہوں نے محض پینترے یا زیور یا صنائی یا کاریگری ہونے سے بچا لیا اور معنویت ،وزن اور وقار عطا کر کے پر مغز دل کشا اور دل آسا بنایا۔'' (۲)

مخالفین و معاصرین کچھ بھی کہیں ایک بات روز روشن کی طرح عیاں اور طے ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کی جتنی انرجی بھی صرف کی وہ صرف اور صرف انسانی ہمدردی اور بہتری کے لیے وقف تھی ۔ رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ابو اللیث صدیقی سید احتشام حسین، خلیق انجم،خیال امروہوی،صلاح الدین محمود ، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی نے کئی مواقع پر اُن کی بھر پور حمایت کی ۔بابائے اردوحضرت مولوی عبدالحق نے ان کو متعدد بار قوم کا مصلح کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہو گا جتنا کہ انہیں اپنی قوم سے تھا سوتے ، جاگتے، اٹھتے بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔سر سید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا ۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید ، شیخ،مغل،پٹھان تھی، سر سید نے اسے'' نیشن'' کا ہم معنی بنا دیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔''(۳)

آپ کے دور میں اور آپ کے بعد بھی کچھ ناقدین ،مخفی طور پر اور کچھ سرِ عام آپ کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ جن لوگوں نے خصوصی طور پر آپ کے نظریات سے کم یا بیش اختلاف رکھا ان میں سلیم احمد، محمد حسن عسکری، شمیم احمد، مولا محمد قاسم نانوتوی، مولوی سمیع اللہ، مولا نا عبدالحئی، مولوی علی بخش خان، طفیل احمد منگلوری ، اسلوب احمد انصاری ، جمال الدین افغانی، مولانا عبدالحق حقانی اور مولوی امدادالعلی و دیگر قابل ذکر ہیں ۔ کچھ لوگوں کو تو آپ کی شخصیت سے خدا واسطے کا بیر تھا اور کچھ نے تو آپ کی علی گڑھ تحریک کی مساعی کو بھی واضح طور پر رگڑا ہے۔ مولوی امدادالعلی تو یہاں تک کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ:

''بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکہ دینے ،حکام وقت کے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر بر خلاف اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جا کٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا ، اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکامِ وقت ، جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے ، اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور ان کے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ ان کے خبیث طینت کا کہ مکرو دغایوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغا باز سمجھنے کے ان کو اچھا نہیں جانتے اور ان کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے۔''(۴)

ان سب باتوں کو جزوی یا کلی طور پر بہت سے دانشور مسلسل رد کرتے رہے ہیں، یا اس سب سے اختلاف رکھتے رہے ہیں ۔ ان میں مولا نا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ پیش پیش رہے ہیں۔ اگر چہ سر سید کے نظریہ عقل و فطرت ڈی ازم کی توسیع گردانا گیا ۔ یا پھر اسے اقبال سے تقابل کیا جاتا رہا۔ یہ تک کہنے میں عار نہ تھی کہ

''ڈاکٹر اقبال نے علم کے حصول کے تین ماخذوں کی نشان دہی کی ہے ۔ تاریخ،فطرت اور متصوفانہ تجربہ، سر سید نے صرف فطرت سے کسب فیض کرنے پر سارا زور صرف کر دینے سے علم کے حصول کے اور سارے دروازے مقفل کر دیے ہیں۔''(۵)

دوسری طرف معاملہ مختلف تھا۔ سر سید نے انتہائی جودت سے اپنی قوم کا مشاہدہ کیا ،اپنے دوستوں دشمنوں میں فرق سمجھا،اسلامی علوم کی تہہ تک پہنچے اور مغربی فکر کا تجزیہ کیا ۔ آپ نے قائد آعظم کی طرح حالات اور ماحول کو جج کر لیا تھاکہ بحثیت قوم ہمیں سب سے پہلے اپنی کن خامیوں کو دور کرنا ہے اور کن معاملات پر نظر ثانی کرنا ہے:

''یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ ہندوستان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ----- انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلاایک روز مسٹر شکسپئیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔آخر انہوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا ۔ انہوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔'' (۶)

ہندوستان میں بیک وقت کئی اقوام آباد تھیں اور سر سید کو اس بات کا مکمل ادراک ہو گیا تھا کہ ان سب کو ایک جگہ اکٹھا رہنے پر مجبور کرنا کسی ایک قوم کے لیے بھی درست نہیں ہو گاکیوں کہ کوئی بھی اپنے مذہب، ذات پات،سیاسی وابستگی یا لسانی تعلقات سے باہر سوچنے کا حامی نہیں ،سو یک جہتی کا تصور محال ہو چکا تھایہ سب باتیں اسباب بغاوت ہند میں بھی آپ نے باور کرا دی تھیں:

''ہندوستان فی نفسہ ایک بر آعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں اور مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدارکھا ہے---جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیازہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزوِ اعظم رہے گا---اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا ۔''(۷)

اس سب کے باوجود بھی آپ بے اعتنائی،ہنگامے اور بد امنی کے مخالف تھے ۔ آپ کی درینہ خواہش تھی کہ امن،سکون اور سلوک کادور دورہ ہو۔آپ نے ایک موقع پر یہاں تک بھی کہہ دیا کہ

''ہماری عین خواہش ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں آپس میں محبت و دوستی سے ہندوستان میں رہیں،مگر وہ دوستی اس وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک ایک دوسرے پر غالب آنے کی چال نہ چلے۔''(۸)

کسی خطے کے باسیوں کی پہچان وہاں کا ادب اور زبان ہوا کرتے ہیں ۔ اگر زبان یا ادب پر حملہ ہو جائے تو پھر نہ کلچر باقی رہتا ہے نہ ثقافت نہ تہذیب نہ جینے کا اسلوب ۔ اب یہاں مسئلہ یہ تھا کہ سب سے زیادہ زبان و ادب ہی متاثر ہوئے، تبدیلی لاگو کرنے کے لیے ایک طرف کے لوگوں کے لیے یہ سب لازمی امر بن گیا اور دوسری جانب کے لوگ عجیب و غریب کشمکش کا شکار ہو گئے۔ مسلمانوں نے سیاسی، سماجی،مذہبی، لسانی،جسمانی ، معاشی اور معاشرتی جتنی بھی صعوبتیں برداشت کر لیں تھی ان مصائب کی شامِ غریباں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بنی ،جس نے ان کی نسلوں تک کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا:

''مسلمانوں کو اس انقلاب میں جان و مال اور عزت و ناموس ہی کی قربانیاں نہ دینا پڑیں بلکہ اب سفید سامراج کے روپ میں قدیم تہذیب اور اسلامی تمدن کی موت بھی نظر آ رہی تھی۔'' (۹)

سر سید چوں کہ بلاکے ذہینء تھے ان کی دور بین نگاہ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس دور کے مسلمانو ں کو کس وجہ سے تعلیم سے الگ رکھا جا رہا ہے ۔ انہوں نے اپنے ہمنواؤں کے ساتھ مل کر طے کیا کہ کانگرس کی مجالس جو مسلمانوں کا وقار خراب کر رہیں ہیں ہم ان میں شریک نہیں ہوں گے اور اپنا کوئی علیحدہ لائحہ عمل تیار کریں گے:

''ایسی مجلسوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ہماری قوم کے لیے نا مناسب ہے۔غدر میں کیا ہوا؟ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں دوڑ پڑے۔ہندو تو گنگا نہا کر جیسے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔''(۱۰)

دیار غیر سے آنے والوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جو تہذیب اپنے ہمراہ لاتے ہیں اس کو لاگو کر کے ہی دم لیتے ہیں،سو ایسٹ انڈیا کمپنی والوں نے بھی وہی کچھ کیا جو ان کے من میں آئی۔جب انگریز نے کسی خاص ضرورت کے تحت ہندوستان میں ۱۸۲۳ء میں انگریزی تعلیم کو رائج کرنا چاہا تو ہندو ؤں نے کسی قسم کی لا تعلقی نہ دکھائی اور خوب شوق فرمایاجس کے عوض ان کے ساتھ آنے والے دنوں میں خاصا امتیازبرتا گیا ۔خصوصی طور پر ملازمتیں اور عہدے ان کی جھولی میں رکھ دیے گئے اور مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا۔یہ سب بہت اہتمام سے ہوا۔۱۸۳۷ء میں خطے کی عدالتوں سے فارسی زبان کو بے دخل کر دیا گیا جو دیس کے باسیوں کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔اس بات کا رنج سر سید احمد خان کو بھی بہت ہوا۔ انہوں نے اس درد کو محسوس کرتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں اپنے تعلیمی منصوبے ''خواستگارِ تعلیمِ مسلماناں''کا آغاز کیا۔مسلمانون کی الجھنیں اگر صرف معاش کی حد تک محدود ہوتیں تب بھی ان کو سدھارتے سدھارتے صدیاں لگ جانی تھیں چہ جائکہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک دلدل ہو اور اگر کوئی اس دلدل میں سے باہر نکلنے کی جہد بھی کرے تو یہ ایک سعی لا حاصل سے زیادہ عمل نہیں تھا، کیوں کہ جگہ جگہ رکاوٹوں کی پھسلن ۔بقول ڈاکٹر غافر شہزاد

کوئی اُٹھاکے پھر سے وہیں پہ رکھ آتا ہے
جب ہم دلدل سے کچھ دور نکل آتے ہیں

یہ بے چارے ہر دو طرح سے گورکھ دھندے میں گھس چکے تھے ، مزاہمت کرنا چاہتے تھے ،اس بند گلی سے باہر بھی آنا چاہتے تھے مگر محنت سے جی بھی اُلٹتا تھا۔جیسا کہ شیخ محمد اکرم فرماتے ہیں کہ

''اس زمانے میں انہیں جو نئے مسائل پیش آرہے تھے وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔ اقتصادی اور ذہنی پستی کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہ اس سے بدکتے تھے۔ '' (۱۱)

اب مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ذہانت و جودت کی عدم دستیابی تھی یا قحط پڑا ہوا تھا اور جہالت و ظلمات کی فراوانی تھی بلکہ صورت احوال کچھ یوں تھی کہ ارض وطن ،عقل مندوں سے مکمل خالی نہیں تھی بلکہ درد مندوں کا بھرا پُرا فقدان تھا ۔ ایسے موسم میں جہاں خزاؤں نے اپنا مسکن زیادہ طاقتور بنانے کا سوچ لیا ہو ا ور مکین گھر کو قفس نما سمجھنے پر مجبور ہو جائیں وہاں حیات کانٹا بن جاتی ہے، وہاں اگر منہ میں زبان ہی گنگ کروا دی جائے تو زندگی موت سے بد تر ہو جاتی ہے۔سر سید نے ذاتی مفادات پر قومی مفاد کو ترجیح دے کر ایک انوکھی قسمت آزمائی کی۔انہوں نے اپنا نام کمانے کی بجائے نسلوں کے سینوں میں زندہ رہنا پسند فرمایا۔ مولوی عبد الرحمان ، سر سید کے بارے میں کہتے ہیں:

''ان کاذوقِ ادب ایسا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑ جاتے تو اردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے ۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے قیام سائینٹفک سو سائٹی کے بعد انہیں اردو لغات اور اردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔'' (۱۲)

سر سید نے نہایت ہنر مندی سے اہل ذوق کو بے جا بنیاد پرستی کی بھٹی سے نکال کر جدید نظریہ تہذیب سے متعارف کرایا۔ یہ کام ایسے وقت میں ترتیب پایا جب اس سب کو کفر کے قریب قریب سمجھنے میں عار نہیں تھی ۔ سر سید کے رفقا کار نے بلا مشروط آپ کے ہاتھ مضبوط کرنے

کی ٹھانی۔ انہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے بلا شبہ مقبولیت کی سند کے بغیر انسانی افادیت کے شعور کی لاٹھی کو ہوا دی ، جس سے سر سید کی ادبی جلا کو اور تازگی ملی،یوں سر سید نے یہ جلا اور تازگی بر صغیر کے لوگوں میں بانٹ دی۔سید عبداللہ آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

''سر سید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصرِ ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہوں گے: مادیت ، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری ، سر سید کے مجموعی فکرو ادب کی عمارت انہیں بنیادوں پر قائم ہے اور شاید یہی وہ اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سر سید کا فیضِ خاص سمجھے جا سکتے ہیں ۔ان رجحانات سے اردو کا سارا ادب ان کے زمانے میں متاثر ہوا اور ایک معمولی سے رد عمل سے قطع نظر آج کا مجموعی ادبی فکری رجحان بھی اسی سلسلہ فکرو عمل کی ارتقائی شکل ہے۔چناچہ جدید ترین زمانے کی ترقی پسند تحریک اپنی بیش تر خصوصیات کے لحاظ سے، سر سید کی مادیت ، عقلیت اور حقائق نگاری ہی کی ہم جنس اور اس ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے ۔ '' (۱۳)

ایسے لوگ یا تو ولی ہوتے ہیں یا صوفی جو اتنی زیادہ انسانیت کی خدمت کر جائیں کہ آنے والی نسلیں ان کو اپنی کتابوں اور دلوں میں زندہ رکھیں۔وہ مصنف بھی تھے، انہوں نے تراجم بھی کیے اور مولف و مرتبین میں بھی نام لکھوایا۔ تحفہ حسن،آثار الضادید ، کلمۃ الحق، سیرت فریدیہ، تصحیح آئین اکبری،راہِ سنت در راہ بدعت، جامِ جم،جلا ء القلوب بذکر المحبوب،تسہیل فی جرالثقیل، سلسلۃ الملوک، قول متین در ابطال حرکت زمین، تاریک ضلع بجنور،جواب امہات المومنین، تبئین الکلام،علاج ہومیو پیتھک، احکام طعام اہلِ کتاب،سفر نامہ لندن، سفر نامہ پنجاب، النظر فی بعض المسائل، تفسیر القرآن، تاریخ سر کشی بجنور، رسالہ اسباب بضاوتِ ہند، تفسیر القرآن، رسالہ ابطال غلامی، خطباتِ احمدیہ، تصحیح تاریخ فیروز شاہ، تحقیق لفظ نصاریٰ، لائل محمڈنز انڈیااور تہذیب الاخلاق کے علاوہ بے حساب ان کے خطوط،خطبات اور مقالات وغیرہ کا بے بہا ذخیرہ ان کے کریڈٹ میں محفوظ ہے۔

دورِ موجود میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سر سید نے اپنی ایک زندگی میں ایک زندگی جتنا کام نہیں کیا بلکہ کئی زندگیوں جتنی جہد کی اورکئی حوالوں سے جینے کا شعور انسانوں کے اندر پیدا کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ سر سید جیسی قد آور شخصیت کی اب کس حد تک ضرورت ہے۔ ایک طرف ان کے بارے میں یہ رائے مضبوط ترین ہے کہ سر سید مستقبل، ماضی اور موجودہ عہد کے بہت بڑے مصلح اور نقیب ہیں اور دوسری طرف ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی آرا پر کٹوری میں طوفان بدتمیزی اٹھا لیا جاتا ہے۔ جہاں روز افزوں مسائل کی بھر مار ہو، علمی ، ادبی، مذہبی،فکری ،سماجی ،معاشی اور تہذیبی ادراک،برداشت اور روا داری کی عدم دستیابی کا رواج اُگ رہا ہو،وہاں الطاف حسین حالی کی یہ رائے اذہان کو اپنی جانب کھینچتی ہے کہ

''جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس قدر سر سید کے کاموں کی زیادہ قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی ۔متعدد لوگ ان کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اٹھائیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔''(۱۴)

سر سید کو کافر یا ملحد سے تعبیر کرنے والے اصل میں ان کے نام اور کام سے خائف تھے، ورنہ ان کی مخالفت کرنے والوں کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ سر سید کی مذہب سے گہری جڑت ہے۔ پروفیسر عمرالدین لکھتے ہیں:

''سر سید کے سامنے مسلمانوں کی صرف قومی ترقی کا سوال تھا۔ پرانے مذہبی تصور کو چوں کہ انہوں نے اس میں حارج دیکھا۔ اس لیے اس پر ضرب لگائی اور بوجہ مجبوری مذہبی بحثوں میں اپنے آپ کو الجھایا۔ در حقیقت سر سید اول اور آخر ایک مذہبی آدمی تھے ۔ مذہب کے وسیع تصور اور مذہب کی سچی اسپرٹ نے انہیں ابھاراکہ وہ قومی کام کریں اور اجتماعی بہبود کا علم بلند کریں ۔ ''(۱۵)

یہ بات روزِ تاباں کی طرح سب کے سامنے تھی کہ سر سید کا' انسان' فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ آدم ہوتا ہے۔ ان کا واضح موقف تھا کہ آدم کو مادیت کے سامنے مور بے مایہ نہیں بننا چاہیے بلکہ اپنے نظریہء فطرت کو مذہب کے مطابق ڈھال لینے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ انہوں نے خود بھی اس پر پختہ ایقان رکھا اور مذہب کی سچی تصویر لوگوں کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ

''اسلام نے جن چیزوں کو اچھا یا بُرا بتایاوہ وہی ہیں جو فطرت کی طرف سے اچھی یا بُری ہیں ۔ پس وہ بُری چیزوں سے بچنے کی ، انکو یقینی برا مان کر اور اچھی چیزوں کے حاصل کرنے کی ، ان کو یقینی اچھا جان کر ، کوشش کرتے ہیں اور ٹھیک مسلمان اور سچے تابعدار اور سچی شریعت کے ہوتے ہیں ۔ گناہ بھی کرتے ہیں اور گنہگار بھی ہوتے ہیں ،مگر دغا باز اور مکار اور ریا کار نہیں ہوتے۔'' (۱۶)

فکرِ سر سید کی جتنی آج معاشرے کو ضرورت ہے شاید اس سے قبل اتنی نہ رہی ہو۔ آج بھی کچھ کینہ پروراور نااہل لوگوں کی مذہبی جعل سازی ، فکری پستی اور تخریبی سوچ بے نقاب ہونے کو بے چین ہے ۔ اب وقت کو، اسطرح کی صورت حال میں سر سید جیسے جگر دار اور تہور کی تلاش ہے جو پہاڑ جیسی بے سمتی اور جہالت کی دلدل سے زندگی کی انگلی پکڑے اور بے کس صاحب فراش کو ادراک و بصیرت کے اجالوں سے مالامال کر دے۔سر سید فہمی میں ابھی بہت وقت لگے گا ۔اس کے لیے پہلے خوابِ بے کار سے بیدار ہونا لازمی شرط ہے، تب کہیں جا کر ذہنوں سے جالے اتریں گے، دلوں سے گرد ہٹے گی اور جان کاری ہو گی کہ سر سید نے ہر آنے والے عہد میں مرشد اور معلم کا مقام کیسے حاصل کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر ،سر سید شناسی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ

''تہذیبی کروٹوں ،تمدنی تغیرات اور متغیراقدارکے باوجود بھی سر سید احمد خان جو زندہ رہے تو اسی باعث کہ انہوں نے طرز کہن پر اڑنے کی بجائے عقل کی راہنمائی میں استدلال کی قوت کے ساتھ آئین نو کا پرچار کیا اور یوں ہر عہد کے لیے مرشد اور معلم کا درجہ حاصل کیا۔بظاہر سر سید حال کے مصلح نظر آئے مگر ان کے لیے حال محض لمحہء موجود ہونے کے بر عکس تسبیح روزو شب کے دانے دانے کے مترادف تھا، یوں حال کے لمحات ، مستقبل کے تار حریرِ دو رنگ میں پروئے منور موتی ثابت ہوتے ہیں۔ ''(۱۷)

سر سید کی ہمہ جہت شخصیت کے جتنے گُنوں سے نقاب کشائی کی جائے گی ان سے ملحقہ بہت سے مزید محاسن آشکار ہوں گے۔ان کی ہر ہر خوبی ایک آرٹ تھی اور ہر آرٹ ایک منفرد تحریک کا درجہ رکھتی تھی ۔ ان کو اپنی زندگی میں بھی اپنی ہر آرٹ پر مزاہمت کا سامنا رہا اور بظاہر دنیاسے پردہ فرما جانے کے بعد بھی ان کی تحاریک کو مذموم سوچوں نے پس پشت رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔ ان کی ہر ہر تحریک پر رد عمل کا بیج بویاجاتا، اسے بڑے انہماک سے سیراب کیا جاتا اور یوں بے کار مشقت کاٹ کر اپنے ہم عصروں کے دستر خوانوں پر سجانے کی کوششیں ہوتیں ۔ سر سید جس مزاحمت کے آگے قد آور فلسفے اور عقل و نیچر کے ساتھ نمایا ں تھے اس کو' معتزلہ 'و 'اشارہ 'سے نظر انداز کرنے کی سوچ کو فروغ دیا جاتا رہا۔یوں ان کی عقلوں پر جمود کے تالے پڑتے رہے اور سر سید عام آدمی کے ظاہر و باطن میں تازگی کی مہک بانٹتے رہے۔

قصہ کوتاہ کہ برصغیر پاک و ہند کی فضا ان جانے راستوں پر چل پڑی تھی، جس وقت بے مہارجذباتی انفعالیت اور بلا ضرورت بنیاد پرستی کے بحرِ ظلمات ابن آدم کو بے توجہی کے غوطے دے رہے تھے اس دوران جو ہستی اپنی منفرد شناخت اور خصائص کی حامل تھی، انسانی فلاح کے لیے نئی توجیہات اور نئے افکار و رجحانات کی نشان دہی کر رہی تھی ۔اسی مرد کمال کی معاشرے کو آج بھی تلاش ہے۔سر سید نے جن باتوں کی اپنے زمانے میں نشان دہی کی تھی آج تیسری دنیا

کے ترقی پزیر باشندے ان کو اپنانے میں فخر اور کامیابی سمجھتے ہیں ۔اردو دانوں کو آج محسوس ہوتا ہے کہ سر سید کا حرف حرف انتہائی معتبر تھا۔کاش ہم نے ایک صدی پہلے اگران کی فکر پر کان دھرے ہوتے توآج اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے ہوتے۔آج ہمارا سماجی اور ادبی منظر نامہ کئی لحاظ سے عمدہ اور اعلیٰ شکل میں ہوتا ۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن علوم، فلسفوں ،عمرانیات یا ترقی پسندی کی بات پر کفر کے فتوے لگائے جاتے رہے ، ان فتوے لگانے والوں کی اپنی نسلیں آج ،اس سارے تہذیب و کلچر کو اپنا کر فخر محصوص کر رہی ہیں جس سے ان کی زندگیوں میں علم کی روشنی نے اجالے کر رکھے ہیں۔کاش ان کم فہموں کے پُرکھوں نے بھی اپنی ذاتی عناد اور ضد کی بجائے آزاد ہو کر سر سید کی فکر کو سمجھا ہوتاتو شاید آج ہمارا معاشرہ بھی ترقی یافتہ معاشروں کی صف میں کھڑا ہوتا ۔ آج کی دنیا کو اسی مرد آہن کی اعلیٰ فکر اور بلند حوصلے کی طلب ہے جو پچھلی صدی میں ہی آئند ہ کی صدیوں کو پیش آنے والے مسائل کی گرہیں کھولتا ہے ۔

حوالہ جات:

(۱) *حیات جاوید* (حالی)نیشنل بک ہاؤس،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۵۴۰
(۲) آل احمد سرور،''تہذیب ادب میں سر سید کا کارنامہ'' ، مشمولہ *انتخاب آل احمد سرور* ، مرتبہ فقیر احمد فیصل ، لاہور اکیڈمی لاہور، سن ندارد، ص: ۶۳،۶۴
(۳) مولوی عبدالحق، *سر سید احمد خان ، حالات،وافکار*،انجمن ترقی اردو ، کراچی،۱۹۵۹ء، ص:۷۶
(۴) مولوی امداد علی ،بحوالا حالی،*حیاتِ جاوید*،نیشنل بک ہاؤس،لاہور،۱۹۸۶ء، ص:۵۷۰،۵۶۹
(۵) اسلوب احمد انصاری، ''سر سید کا نظریہ عقل و فطرت''، مشمولہ *مسلک*، ایجوکیشن کالج ملتان ، ۲۰۰۰ء ، ص: ۹۶
(۶) *حیاتِ جاوید* ، ص: ۵۸۳
(۷) *حیاتِ جاوید* ، ص: ۱۶۹
(۸) *حیاتِ جاوید* ، ص: ۱۷۳
(۹) سلیم اختر ،ڈاکٹر،*اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ*،سنگِ میل پبلی شر،لاہور،۱۹۸۷ء،ص: ۱۹۰
(۱۰) *حیاتِ جاوید* ، ص: ۱۷۸
(۱۱) محمد اکرم، شیخ،*موجِ کوثر*، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سن:۱۹۸۲ء،ص: ۷۷
(۱۲) محمد اکرم چغتائی،مرتب:*مطالعہ سر سید*،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ ء ، ص : ۱۰۵
(۱۳) عبد اللہ، سید ، داکٹر،*سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا*، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،بار سوم،پبلش ۱۹۹۴ء، ص:۲۵۱
(۱۴) الطاف حسین حالی، *حیات جاوید*، نیشن بک ہاؤس،لاہور، ۱۹۸۶ء،ص:۲۱
(۱۵) عمر الدین، پروفیسر،*سر سید احمد خان کا نای مذہبی طرز فکر* ، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء ، ص:۲۲
(۱۶) *مقالات سر سید*، حصہ سوم،مرتبہ:اسمعیل پانی پتی، ۱۹۸۷ء، ص:۴۴
(۱۷) سلیم اختر ، ڈاکٹر، *کیا آج سر سید کی ضرورت ہے* ، چہار سو، راولپنڈی ، مارچ۔اپریل،۲۰۰۰ء